حضرت العلام مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی

دوام حدیث

تفسیر بالروایت پر منکرین حدیث کے اعتراضات

اور
ان کے جوابات

اب ہم ان اعتراضات کا ذکر کرتے ہیں جو مقام حدیث میں منکرین نے کیے ہیں۔

پہلا سوال

۱- وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ (۲۶۰:۲)

اور جب کہا ابراہیم نے کہ اے میرے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا تو ایمان نہیں لایا ہے۔ ابراہیم نے کہا کہ بے شک (میں ایمان لایا ہوں) لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے

اس کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہ سے صحیح بخاری میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ابراہیم سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جبکہ انہوں نے کہا کہ اے رب! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

یہ روایت قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی۔ کیونکہ قرآن نے حضرت ابراہیم

کے ایمان کی تصریح کردی ہے اور وہ بھی "بلیٰ" کے لفظ کے ساتھ یعنی بے شک میں مومن ہوں اور ایمان نام ہے علم الیقین کا جس میں:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا

مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہ کیا۔

چہ جائیکہ حضرت ابراہیم جیسے اولو العزم رسول کا ایمان اللہ کے مردوں کو زندہ کرنے پر جو بادشاہ سے اس مسئلہ پر بحث کر چکے تھے۔ جس کا ذکر اس سے پیشتر کی آیات میں ہے ان کو اس کے اوپر علم الیقین اور ایمان کامل حاصل تھا۔ وہ چاہتے تھے صرف اطمینان اور عین الیقین نہ کہ کسی شک کا ازالہ۔ مگر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ابراہیم کو شک تھا اور عقل کے خلاف اس وجہ سے ہے کہ دنیا کے دو سب سے بڑے پیغمبروں میں سے ایک کو اللہ کی صفت احیاء اموات میں شک ہو اور دوسرا اپنے آپ کو ان سے بھی زیادہ کا حق دار سمجھے تو پھر ایمان اور یقین کس کے اندر تلاش کیا جائے گا" (مقام حدیث۔ ج ۲ ص ۱۲۰)

جواب

اس حدیث سے شبہ کی وجہ خود ساختہ مطلب ہے۔ حالانکہ حدیث کے ایسے معانی بھی لیے جا سکتے ہیں کہ جن پر اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

۱۔ جب ہم کو شک نہیں تو ابراہیم کو کیسے شک ہو سکتا تھا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے قرآن مجید میں ہے:۔

اِنْ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ　　(زخرف آخری رکوع)

اگر رحمان کی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا۔

مگر میرا عبادت نہ کرنا اس وجہ سے ہے کہ رحمان کی کوئی اولاد نہیں۔ اسی طرح اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہم ابراہیم سے شک کے زیادہ حق دار ہیں۔ جب ہم شک نہیں کرتے تو ابراہیم نے کیسے شک کیا ہوگا۔

۲۔ شک کا تعلق دعا کی قبولیت سے ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کا سوال اس بنا پر تھا کہ ان کو یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ میری دعا قبول کر لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مطلب کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو دعا کی قبولیت میں شبہ ہوا تو ہم کو کیسے یقین ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم بھی اپنی دعا و استجابت کا یقین نہیں رکھتے۔ اللہ چاہے تو قبول کرے چاہے تو قبول نہ کرے۔

عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ علم انک اجبتنی دعائی کہ تا مجھے یقین ہو جائے کہ تو نے میری دعا قبول کی (فتح الباری ج ۳ ص ۲۴۲)

۳۔ شک کا تعلق معین کیفیت کے ساتھ ہے (کہ صرف حکم سے زندہ کرتا ہے یا اسباب کے واسطہ سے اگر اسباب کے واسطہ سے زندہ کرتا تو وہ اسباب کیا ہیں) کسی قسم اور یقین کا تعلق نفس زندہ کرنے کے ساتھ ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام کو احیاء موتی (مردوں کو زندہ کرنے) پر اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کا تو یقین تھا مگر اس کی کیفیت معینہ میں شک تھا اسی واسطے زندہ کرنے کی کیفیت سے سوال کیا نہ زندہ کرنے سے پس حدیث کا ترجمہ یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو جس امر میں شک تھا۔ ہم بھی اس میں شک رکھتے ہیں بلکہ اس معاملہ میں ان سے زیادہ شک کے حقدار ہیں وہ معاملہ کیفیت احیاء کا تھا نہ نفس احیاء کا۔

تفسیر بالاحادیث پر دوسرا سوال

۲۔ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا (۲۲- ۱-۲)

بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے۔ جس دن تم اس کو دیکھو گے کہ اس دن ہر دودھ پلانے والی اپنے بچے کو جسے اس نے دودھ پلایا ہے، بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل جن دے گی۔"

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کا زلزلہ اس قدر ہولناک ہوگا کہ اس کو دیکھتے ہی دودھ پلانے والیاں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی اور

حمل والیوں کے حمل مارے خوف کے گر جائیں گے۔ لیکن اس کی تفسیر روایت میں یوں ہے کہ:۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن آدم سے کہے گا کہ تم اپنی ذریت میں سے جہنم کا حصہ نکالو وہ کہیں گے کہ کس قدر؟ جواب ملے گا ایک ہزار میں سے ۹۹۹۔ اس وقت حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے۔

یہ خلاصہ ہے بخاری کی روایت کا اور یہی ترمذی میں بھی ہے۔ مگر یہ تفسیر قرآن کے بالکل منافی ہے کیونکہ قرآن میں ذہول اور وضع حمل کی علت زلزلہ کی ہولناکی ہے اور اس روایت میں جہنم کا حصہ نکالنے کے حکم کی گرانی۔ قرآن میں اس کا وقت ہے "یوم ترونہا" جس دن تم زلزلہ کو دیکھو گے اور روایت میدان قیامت میں محاسبہ کا اس کے لیے معین کرتی ہے جہاں کسی زلزلہ کا ثبوت نہیں۔

پھر یہ میدان قیامت میں ہر قسم کے مؤنث جانداروں میں حمل کس وقت کے ہوں گے جو گریں گے۔ اور وہاں ان کے اسقاط حمل کس وقت کے ہوں گے جو گریں گے اور وہاں ان کے اسقاطِ حمل کی غرض وغایت کیا ہوگی؟ اس کو مجازاً شدت خوف کا استعارہ سمجھا جائے تو جب حقیقی معنے بن سکتے ہیں تو مجازی معنی لینے کی کیا ضرورت ہے؟

آیت سے ذہن جس طرف متبادر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حالت دنیا میں نفخ صور کے وقت ہوگی۔ جب آسمان پھٹ جائے گا، ستارے ٹوٹ پڑیں گے۔ زمین میں بھونچال آئے گا اور زلزلہ برپا ہوگا۔ لیکن یہ روایت اس کو نفخ صور دوم کے بعد میدان قیامت کا حال قرار دیتی ہے جو آیت کے سراسر خلاف ہے۔ اس لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہرگز نہیں ہوسکتا"۔ (مقام حدیث ج ۲ ص ۱۳-۱۴)

خلاصۂ اعتراض

اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

۱۔ آیت میں نفخہ اولیٰ کی حالت مندرج ہے اور حدیث اس کو نفخہ دوم کی طرف لے جاتی ہے۔

۲۔ نفخہ دوم میں تو حمل نہیں ہوں گے۔ اگر اس (اسقاط حمل وغیرہ) کو شدت خوف سے استعارہ قرار دو تو یہ ممکن نہیں کیونکہ مجازی معنے اس وقت لیا جاتا ہے جب حقیقی معنے نہ بن سکے۔

الجواب

قرآن میں یہ تصریح نہیں کہ یہ زلزلہ نفخہ اولیٰ کا ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے مراد نفخہ ثانیہ کے بعد جو ہولناکی ہوگی اس کو زلزلہ سے تعبیر کیا ہو یا اس وقت بھی حقیقتاً زلزلہ آئے جیساکہ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے:۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ الخ

جب زمین میں اس کا زلزلہ آئے گا اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی اور انسان کہے گا اسے کیا ہوا۔ اس دن اپنی خبریں سنائے گی کیونکہ اس کو اللہ نے حکم دیا ہے۔ اس دن لوگ مختلف حالتوں میں واپس ہوں گے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ نفخۂ ثانیہ کے بعد بھی تمام لوگوں کے سامنے ایک زلزلہ ہو گا۔ باقی رہا یہ کہ نفخہ دوم کے بعد حمل کہاں سے آئے گا۔ علماء نے اس کا جواب دو طرح سے دیا ہے:۔

۱۔ جو عورت جس حالت میں مری ہو گی اسی حالت میں اٹھائی جائے گی۔ اگر حمل کی حالت میں مری ہو گی تو حمل کی حالت میں اٹھائی جائے گی۔ جب اس زلزلہ کا مشاہدہ کرے گی تو زلزلہ کی ہولناکی سے اس کا حمل ساقط ہو جائے گا اور یہ زلزلہ اسی وقت آئیگا،

جب اللہ تعالیٰ آدم کو حکم دیں گے کہ اپنی ذریت سے جہنم کا حصہ الگ کرو۔ اس آواز کی وحشت کا اثر جیسے لوگوں پر ہو گا اسی طرح زمین پر بھی ہو گا۔ لوگ اس آواز کی وحشت اور زلزلہ کی شدت سے گھبرا جائیں گے۔ حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے۔

۲۔ یہ شدت خوف سے کنایہ ہے یعنی وہ حالت سخت ہولناک ہو گی اگر حاملہ کا حمل بھی ہو گا تو گر جائے گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ جب حقیقی معنے ممکن ہو تو مجازی معنے نہیں لینا چاہیئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قیامت کا دن بہت لمبا ہو گا جس کا اندازہ بعض جگہ پچاس ہزار سال بتایا گیا ہے۔ پس اس دن میں مختلف اوقات ہوں گے، اور بہت سی باتیں ہولناکی کی ہوں گی۔ اگر یہ آواز پہلی ہولناکی کے وقت ہو گی تو اس وقت حقیقی معنی لینا ممکن ہے کیونکہ ہر حاملہ جو حمل کے ساتھ مری ہے اسی حالت میں موجود ہو گی۔ پس اس کے حمل کا گر جانا عین ممکن ہے مگر قرآن نے چونکہ تصریح نہیں نہ حدیث میں وارد ہے کہ یہ آواز کتنے عرصہ کے بعد ہو گی۔ اگر یہ آواز اس زلزلہ اور ہولناکی کے بعد ہو جس میں حمل گر چکے ہیں تو اس صورت میں اس آواز کی دہشت اور اس زلزلہ کی ہولناکی سے حمل تو نہیں گر سکتے۔ پس اس وقت لامحالہ شدت خوف سے بھی استعماری ماننا پڑے گا۔

دوسرا جواب

بخاری کی حدیث میں صرف اس آیت کا اتنا اقتباس ہے:۔

وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ

تو لوگوں کو نشے میں دیکھے گا اور وہ نشے میں نہیں ہوں گے، لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔　　(الحج ۲)

اس اقتباس کا یہ مطلب نہیں کہ آنحضرت سورۃ الحج کی آیت کی تفسیر فرما رہے ہیں۔ بلکہ اس آواز کی دہشت کا جو اثر ہو گا اس کا ذکر فرما رہے ہیں۔ یعنی آیت میں نفخہ اولی مراد ہے مگر حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے اس کا تعلق نفخہ ثانیہ کے بعد کے ساتھ ہے۔ اعتراض کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کو اس آیت کی تفسیر سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ

اقتباس سے یہ مقصد نہیں کہ آیت کی تفسیر کی جاوے بلکہ یہ مقصد ہے کہ اس آواز کی شدت کے اثر کو قرآنی الفاظ سے بیان کیا جاوے۔ باقی رہی یہ بات کہ امام بخاری اس حدیث کو اس لفظ (وَ تَرَى النَّاسَ سُكَارٰى) کی تفسیر میں کیوں لاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ محدثین کتاب التفسیر میں ایسی حدیثیں بھی ذکر کر دیتے ہیں جن کی آیت سے لفظی مثال نہ ہو اور اس صورت میں وضع حمل جس کا ذکر حدیث میں ہے یا شدت سے کنایہ ہوگا یا حقیقت پر محمول ہوگا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

امام ترمذی نے کتاب التفسیر میں جو حدیث ذکر کی ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ جب سورہ حج کی آیت مذکورہ نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ تم کو علم ہے کہ دن کونسا ہے صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ اس پر آپ نفخہ ثانیہ کے بعد والا واقعہ بیان کیا۔ مگر اس میں حمل کے گرنے کا ذکر نہیں اور قرآن کی اصطلاح میں نفخہ اولیٰ سے لے کر نفخہ ثانیہ کے بعد جی اٹھنے اور حساب و کتاب ہونے سے فراغت پانے تک جو عرصہ ہے وہ ایک ہی دن کہلاتا ہے۔ جس کے شروع میں آسمان پھٹے گا۔ پھر آخر میں جنت و دوزخ میں داخلہ ہوگا۔ اس حدیث میں تو آیت مذکورہ کا کوئی اقتباس نہیں۔ صرف اس دن کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے۔ جس دن کے شروع میں نفخہ اولیٰ ہوگا۔

قرآن مجید میں اس کی نظیر دیکھنی ہو تو سورۃ تکویر اور سورہ انفطار اور سورہ انشقاق پڑھیئے۔ ان سورتوں میں آسمان کے پھٹنے، سورج کے بے نور ہونے کا ذکر اور پھر آخر میں حساب کا بھی ذکر ہے۔ سب کے لیے ایک ہی دن بتایا گیا ہے۔ مثلاً سورہ انفطار کو دیکھیئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (الانفطار: ۱ تا ۵)

جب آسمان پھٹ گیا اور تارے جھڑ گئے اور سمندر جاری کیے گئے

اور قبریں اکھاڑی گئیں ۔ ہر جاں اپنے کیے اور چھوڑے کا جائزہ لے گی ۔ پھر نفخہ اولیٰ کے وقت تو صرف بالغ ہی ہوں گے ۔ کیونکہ کچھ عرصہ پہلے عورتیں بانجھ ہو جائیں گی ۔ اس وقت نہ کوئی عورت حاملہ ہوگی نہ دودھ پلانے والی ۔ کیونکہ قیامت صرف مجرموں پر قائم ہوگی جیسا کہ سورہ مرسلات سے معلوم ہوتا ہے ۔

أَلَمْ نُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْآخِرِينَ كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ

کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں ۔ پھر ان کے پیچھے دوسروں کو نہیں لگایا اسی طرح ہم (نفخہ اولیٰ کے وقت) مجرموں سے کریں گے ۔ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے (ہی) تباہی ہے ۔

جب نفخہ اولیٰ کے وقت سب مجرم ہی ہوں گے تو اب حمل یا دودھ پلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ کیونکہ بلوغت اور عقل کے بعد ہی انسان مکلف ہوتا ہے ، مکلف ہونے کے بعد ہی بصورتِ جرم مجرم کہلا سکتا ہے ۔ پس لامحالہ اگر نفخہ اولیٰ لیا جائے تب بھی حقیقی معنے ممکن نہیں بلکہ وضع حمل یا ذہول کو شدت سے استعارہ ہی ماننا پڑے گا ۔ ہاں دوسرے نفخہ کے بعد حقیقت کی ایک صورت ممکن ہے ، کہ جو عورتیں نفخہ اولیٰ سے حمل کی حالت میں مرگئی ہیں وہ اسی حالت میں اٹھیں گی ۔

تفسیر بالروایت پر تیسرا اعتراض

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ (۱۷ : ۱۰۱)

اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں ۔

اس کی تفسیر روایت کے ساتھ اس طرح کی گئی ہے :

ایک دفعہ آنحضرت تشریف فرما تھے ۔ سامنے سے دو یہودی گزرے ، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں ۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو ، وہ سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کونسی دی گئی تھیں ؟

آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں (۱) کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ (۲) زنا نہ کرو (۳) کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو (۴) چوری نہ کرو (۵) جادو نہ کرو (۶) کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ (۷) سود نہ کھاؤ (۸) کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ (۹) میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لیے اے یہود! دسواں حکم یہ ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔ یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن جریر میں ہے حضرت موسیٰ کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے اور جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کے رو سے اس کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نو نشانیاں حضرت موسیٰ کو اس وقت ملی تھیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت نہ توریت نازل ہوئی تھی اور نہ اس کے احکام عشرہ تھے۔ ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ سورہ نمل میں ہے:

فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ (۲۷: ۱۲)

نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف

پھر سورہ اعراف میں حضرت موسیٰ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان نشانیوں کو گنا دیا ہے۔ یعنی عصا، ید بیضا، قحط، نقص ثمر، طوفان، ٹڈی، جوں مینڈک اور خون۔ اس کے مذکور بعد حضرت موسیٰ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے ہیں۔ فرعون مع اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہے اور سمندر میں غرق ہوتا ہے اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیے ہوئے کوہ طور کی طرف آتے ہیں۔ وہاں اللہ ان کو میقات پر بلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے توریت عطا کرتا ہے۔

يٰمُوْسٰى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِى وَبِكَلَامِى فَخُذْ مَا اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ　وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ (۷: ۱۴۴-۱۴۵)

اسے موسیٰ! میں نے تجھ کو اپنے پیغامات اور اپنی ہم کلامی کے لیے لوگوں پر چن لیا سو جو کچھ میں تم کو دیتا ہوں لے اور شکر کر اور ہم نے اس کے لیے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی۔

علاوہ بریں اس روایت میں سود نہ کھاؤ۔ جادو نہ کرو، میدانِ جہاد سے نہ بھاگو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے احکام عشرہ میں سے گنائے گئے ہیں حالانکہ ان تینوں میں سے ایک بھی ان میں سے نہیں۔ احکام عشرہ یہ ہیں:-

۱۔ میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو۔　۲۔ تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے (جھوٹی قسم نہ کھا)　۳۔ سبت کے دن کو یاد رکھ

۴۔ اپنے باپ اور ماں کو عزت دے　۵۔ خون نہ کر

۶۔ زنا نہ کر۔　۷۔ چوری نہ کر

۸۔ اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ　۹۔ اپنے ہمسایہ پر جھوٹی گواہی نہ دے۔

۱۰۔ اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر۔ (توریت نصر استثنا ۵-۶)

(مقام حدیث، ج ۲ ص ۱۴ تا ۱۷)

اس اعتراض کا ماحصل یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو نشانیاں دی گئی تھیں جن کا ذکر سورہ اسراء میں ہے۔ وہ معجزات جن کا ذکر سورہ اعراف میں ہے اور آنحضرت نے نو نشانیوں کی تفسیر جو توریت کے احکام عشرہ کے ساتھ کی ہے۔ وہ غلط ہے

۱۔ کیونکہ یہ احکام فرعون کے غرق ہونے کے بعد دیے گئے اور نو نشانیوں پہلے دی گئیں

۲۔ پھر ان میں توریت کے ساتھ موافقت نہیں۔

۳۔ توریت احکام عشرہ (دس) ہیں اور حدیث میں نو ہیں

ب۔ تین نشانیاں جن کا حدیث میں ذکر ہے توریت میں ان کی جگہ اور تین ہیں۔

اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ معترض کے دماغ میں معجزات اور توریت کے احکام عشرہ ہیں وہ قرآن مجید کی آیت مذکورہ میں (جو نو آیات کا ذکر ہے) بھی معجزات سی مراد لے رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ معترض کو توریت ترتیل فرعون کے غرق ہونے کے بعد۔ احکام عشرہ انہی میں ہیں۔ نو آیات کا ذکر تو موسےٰ علیہ السلام کی بعثت کے ساتھ ہی ملتا ہے۔ پھر ان نو نشانیوں کی تفسیر میں احکام کا ذکر نا ممکن ہے۔ پھر احکام عشرہ کے ساتھ بھی تطابق نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں نو آیات سے مراد نو احکام ہیں اور یہ نو احکام وہ نہیں جن کو احکام عشرہ کہتے ہیں جو تختیوں میں ملے اور فرعون کے غرق ہونے کے بعد دیے گئے بلکہ یہ وہ احکام ہیں جو شروع بعثت میں موسےٰ علیہ السلام کو دیے گئے توریت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ توریت موسےٰ علیہ السلام کو بعد میں دی گئی۔ جب فرعون غرق ہوا مگر کچھ احکام شروع میں دیے گئے تھے ان کو بھی کتاب ہی کہا جاتا ہے۔ جیساکہ سورہ فرقان میں ہے:۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِیْرًا ۔
فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَی الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِیْرًا ۔

ہم نے موسےٰ کو کتاب دی اس کے ساتھ اس کا بھائی ہارون وزیر بنایا، پھر ہم نے کہا دونوں اس قوم کی طرف جاؤ جو ہمارے احکام نہیں مانتے۔ پھر ہم نے ان کو بالکل برباد کر دیا۔

سورہ بنی اسرائیل میں بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ وہاں یہ ذکر ہے کہ ہم نے موسےٰ کو نو آیات دیں، پھر بنی اسرائیل سے پوچھ جب وہ ان کے پاس آیا۔ بس اس کو فرعون نے کہا اے موسےٰ تو مسحور ہے۔ پھر اس کے بعد ان آیات کو بصائر کہا ہے اور بصائر کا اطلاق قرآن پر بھی ہوا هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے بصائر، (دلائل) ہیں۔

سورہ نمل میں جو دو معجزوں کا ذکر کر کے یہ فرمایا ہے فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ

دقوم من نو آیات میں فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف)۔ اس آیت کا بھی یہ مطلب کیا جا سکتا ہے کہ دو معجزوں کے ساتھ یہ نو احکام لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں نو آیات سے مراد معجزات ہوں مگر حدیث مطلق آیات سے سوال نہیں بلکہ آیات بینات سے ہے اور آیات بینات کا لفظ صرف بنی اسرائیل میں ہے وہاں صرف نو احکام مراد ہیں

دوسرا جواب

محدثین نے کہا ہے کہ روایت ترمذی میں اختصار ہے۔ آپ نے آیات بینات میں معجزات کا ذکر کیا تھا مگر چونکہ وہ قرآن مجید میں ذکر ہونے سے مشہور ہو گئے تھے۔ اس واسطے راوی نے ان کا ذکر نہیں کیا مگر جو اخلاقی باتیں بطور وعظ آپ نے بیان فرمائیں وہ چونکہ اس ترتیب کے ساتھ غیر مشہور تھیں۔ اس واسطے ان کا ذکر کر دیا اور یہ احکام نو آیات کی تعبیر نہیں تاکہ اعتراض وارد ہو۔

پھر اس حدیث کو اگرچہ امام ترمذی نے صحیح کہا ہے مگر اس کا ایک راوی عبداللہ سلمہ ہے۔ اس توثیق مختلف فیہ ہے۔ امام بخاری فرماتے ہیں لا یتابع علی حدیثہ (میزان ج ۲ ص ۹۲) اس کی حدیثوں کی اور راویوں سے تائید نہیں ہوتی وقال النسائی یعرف وینکر (میزان ج ۲ ص ۴۲) اس کی روایتیں معروف و منکر دونوں قسم کی ہیں۔ امام ابن کثیر نے تفسیر میں عبداللہ بن سلمہ کے متعلق کہا ہے۔ فی حفظہ شیء وقد تکلموا فیہ (ج ۳ ص ۶۷) اس کے حافظہ میں نقص ہے۔ اس میں محدثین نے کلام کی ہے۔ پھر توریت پر اعتماد کرنا جن کو خود معروف مانتے ہیں کیسے درست ہے جہاں محدثین کا اختلاف ہو وہاں سوچنا پڑتا ہے اور جہاں اتفاق ہو وہاں بدون غور و فکر کے عمل کیا جاتا ہے۔ جب محدثین کے نزدیک خود ایک روایت متکلم فیہ ہو پھر اس کو لے کر احادیث صحیحہ اتفاقیہ پر اعتراض کرنا کس طرح درست ہے۔